© rasailojaraid.com

مولانا عبدالستار حماد

قسط نمبر ۱۳

عصمتِ انبیاء علیہم السلام

اعتراض نمبر ۲۴:

قرآنِ مجید میں ہے:

"انا فتحنا لک فتحا مبینًا ہ لیغفرلک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر"

نیز: "فاستغفر لذنبک"

اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گناہ سے بالکل منزہ تھے تو "استغفار ذنوب" اور غفران ذنوب کے کیا معنی ہیں؟ ان آیات سے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "معصوم عن الذنب" ثابت نہیں ہوتے۔

الجواب:

چونکہ معترض کو لفظ "ذنب" سے غلط فہمی ہوئی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ الفاظ جناح، ذنب، خطا، اثم، جرم وغیرہ میں فرق واضح کر دیں تاکہ معترض کی غلط فہمی کو دور کیا جاسکے اور بتایا جاسکے کہ اس مقام پر "ذنب" کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

زبانِ عرب میں عام طور پر گناہ کے لئے "جناح" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے معنی "میلان" کے آتے ہیں۔ چونکہ گناہ کی حالت میں انسان حکمِ خدا سے سرتابی کرتا ہوا خواہشِ نفسانی کی طرف مائل ہوتا ہے اس لئے اس کو جناح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس میلانِ طبع کے مختلف وجوہات اور متفاوت مدارج و مراتب ہوتے ہیں۔ اگر نادانستہ اور بلا قصد و ارادہ ہو تو اسے "خطا" کہتے ہیں۔ اور خطا کی تعریف ہے "درستگی کو نہ پہنچنا" جیسے عام محاورہ ہے "اخطاء السھم ای تجاوزہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

د لم یصب » یعنی تیر نشانے سے تجاوز کر گیا، ٹھیک نہ لگا۔

اسی طرح فہم انسانی بھی کبھی امر مقصود سے تجاوز کر جاتا ہے اور مرضی الٰہی کے خلاف ہوتا ہے اسی کو کہتے ہیں کہ خطا سرزد ہو گئی یا وہ خطا کا مرتکب ہوا۔ عرفِ عام میں خطا سے مراد وہ غلطی ہوتی ہے جو بلا قصد و ارادہ ہو۔ چنانچہ کتب لغت میں مذکور ہے کہ:

"خطا خطأً من باب علم واخطا فهي واحد لمعن يذنب على غير عمدٍ"

یعنی لفظ خطا مجرد اور ایک معنی کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی نادانستہ غلطی۔

اور لفظ " ذنب " عام ہے خواہ دانستہ سرزد ہو یا نادانستہ۔ جیسا کہ کتب لغت میں لکھا ہے:

" ان الذنب مطلق الجرم عمداً کان او سهو "

یعنی لفظ " ذنب " عام ہے خواہ دانستہ یا نادانستہ غلطیوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے "

اور " اثم " اور " جرم " ایسے سنگین گناہ اور فاش غلطیوں کو کہتے ہیں جو عمداً اور بارادہ و قصد سرزد ہوں۔ چنانچہ ہمارے سابقہ صفحات میں یہ بات تفصیلاً ذکر کی گئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے اگر کوئی لغزش ہوتی ہے تو وہ سہو و خطا اور نسیان سے بڑھ کر نہیں ہوتی اور لغت کے اعتبار سے بھی " ذنب " کی ایک قسم سہو و خطا ہے۔ تو زیر بحث آیات میں بھی لفظ " ذنب " سہو و خطا کیلئے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس معنیٰ کی تائید حضرت علامہ ابن حزم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

" انبیاء علیہم السلام کے وہ گناہ بھی جسے وہ غلطی اور نسیان سے کر گزرتے ہیں یا خدا کے نزدیک علو مرتبت، رضا جوئی اور طلب خوشنودی کے طور پر کرتے ہیں مگر وہ منشا الٰہی کے مطابق نہیں ہو پاتا، گناہ شمار ہو کر لائق سرزنش ٹھہرتے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ ہم نے آپ کے سابقہ و لاحقہ گناہ معاف کر دیئے ہیں یعنی اس قسم کی بات اگر آپ سے ہو جائے تو وہ ہمارے ہاں معاف ہے اور اس پر آپ قابلِ مؤاخذہ اور لائق سرزنش نہیں ہیں۔ اور اس آیت سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نعوذ باللہ جنگِ بدر یا دوسرے کسی موقع پر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کسی گناہ کے کام میں مبتلا ہو گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان و اکرام سے آپؐ کے اس گناہ کو بخش دیا، جیسے معترضین بیان کرتے ہیں۔" (الملل والنحل ج ۴ ص ۲۲)

جواب نمبر ۲:

اہلِ تفسیر نے " غفران ذنب " کی کئی قسم کی تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۔ خطاب الخاص والمراد بہ العام۔ یعنی "ذنبک" کے مخاطب مسلمان ہیں جیسا کہ "یا ایہا النبی اذا طلقتم النساء" میں ہے۔ چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اول مخاطب ہیں اس لئے ان کی وساطت سے گناہوں کی بخشش عام کا مژدہ سنایا ہے۔

۲۔ مخاطب تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی ہیں لیکن ذنب کے معنی ترک اولیٰ یا سہو ونسیان کے ہیں جیسا کہ جواب نمبر ۱ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ متعارف معصیت اور نافرمانی کے معنی میں یہ مستعمل نہیں۔

۳۔ بعض کے نزدیک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے صغائر کا صدور ہو سکتا ہے۔ اس پر سابقہ صفحات میں بحث ہو چکی ہے۔

۴۔ اس سے منصور ثبوت عصمت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا یہ ہے کہ گناہوں کو آپ کی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ تاہم ان سب تاویلات کا نفس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ آیات میں تو فتح مکہ کا ذکر ہے اور اس کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ اور درمیان میں "غفرانِ ذنب" کا ذکر بہ ظاہر غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ لفظ "ذنب" اس جگہ سہو ونسیان یا ترکِ اولیٰ کے معنوں میں مستعمل نہیں بلکہ الزام کے معنی دے رہا ہے۔

تو اس صورت میں آیت کے معنی بالکل صاف اور واضح ہیں کہ فتح مکہ کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اہل مکہ سے نہایت حلم، عفو اور بردباری کا سلوک فرمائیں گے تو ان لوگوں کو زیادہ قریب سے اسلام کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوگا تو وہ الزامات جو آپ کی طرف انہوں نے منسوب کر رکھے تھے یعنی "مجنون" "ساحر" وغیرہ یا جن کے انتساب کا مستقبل میں احتمال پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جائیں گے۔ اور فتح مکہ میں غرض بھی یہی ہے کہ ان لوگوں کو نبوت کے انوار وتجلیات سے استفادہ کی توفیق میسر ہو اور ان کے سینے جو ذات کے متعلق کینہ توزیں اور شکوک وشبہات سے بھرے ہوئے ہیں وہ صاف ہو جائیں اور تمام الزامات کا ازالہ ہو جائے۔

اب "فاستغفر لذنبك وللمؤمنين والمؤمنات" کا مفہوم ملاحظہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لفظ استغفار کئی معانی کا حامل ہے۔ جہاں تک اس کا تعلق حضور علیہ السلام سے ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ آپ کو گناہوں کے عدمِ صدور کی توفیق عنایت فرمائے۔ یعنی آپکو ایسا نور و عرفان اور قوتِ روحانی عطا کرے جس کی وجہ سے گناہوں کے پر فریب پہلو آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور ان سے قطعاً متاثر و منفعل نہ ہوں۔ اور جہاں اس کا تعلق عام مؤمنین صالحین سے ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے لئے مغفرت طلب کریں اور خدا سے دعا مانگیں کہ ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائے۔ یہ ہے ان آیات کا مفہوم جو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے آنے کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ "معصوم انسانوں" کے ایک گروہ کو تیار کریں۔ اس سے ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی معصوم ہوتے ہیں یا نہیں ان کا مقام "عصمت" سے زیادہ اونچا ہوتا ہے۔ وہ ایسی پاکیزگی و طہارت سے بہرہ مند ہوتے ہیں جو عام انسانوں کے حصہ میں نہیں آ سکتی۔ اس لئے ان آیات میں "ذنب" سے مراد ایسا معنیٰ ہرگز نہیں ہو سکتا جو "دامنِ عصمت" کو داغدار بنائے۔

اعتراض نمبر ۵:

"عفا اللہ عنک لم اذنت لھم" الخ

اس جگہ جنگِ تبوک کے موقع پر آپ کا اذنِ عام غلطی تھی۔ تبھی تو "عفا اللہ عنک" استعمال ہوا ہے۔ اگر گناہ نہیں تھا تو اس آیت میں جس معافی کا ذکر ہے وہ کس بات سے متعلق ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے کوئی صدورِ گناہ ہوا تھا۔

الجواب:

اس جگہ معترض نے جو مفہوم سمجھا ہے وہ ہرگز مراد نہیں بلکہ اس مقام پر حضور علیہ السلام نے اپنا اختیار استعمال فرمایا کیونکہ اس سے پیشتر آپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ:

"فاذا استاذنوک لبعض شانھم فاذن لمن شئت منھم"

یعنی "اگر کوئی عذر کی بنا پر آپ سے رخصت مانگے کہ میں جنگ میں حاضر نہیں ہو سکتا تو آپکو کامل اختیار ہے کہ جس کو چاہیں رخصت دیں" کیونکہ سورۂ نور کا نزول غزوۂ تبوک سے پیشتر ہے اس لئے اذن کا اختیار آپ کو واقعۂ تبوک سے قبل مل چکا تھا۔ تو آپ نے اس اختیار کے پیشِ نظر جنگِ تبوک کے زنت رخصت مانگنے والوں کو رخصت دیدی۔ لیکن تسامح صرف اس قدر ہوا کہ آپ نے بعض اشخاص کے حالات کی تحقیق نہ کی اور اللہ تعالیٰ کے اذن کا انتظار نہ کیا جو علمِ الٰہی میں غیر مناسب تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پر وہی اصول کاربند ہوتا ہے جو ہم "اہم اصول" کے زیرِ عنوان ۶ کے تحت ذکر کر آئے ہیں یعنی تقدیم و تاخیر گناہ نہیں یعنی جو حکمِ رخصت دیر سے دینا تھا وہ کچھ وقت پیشتر دے دیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ لیکن چونکہ ترکِ اولیٰ تھا اس لئے تنبیہ کر دی گئی۔ حضور علیہ السلام کا ہر تسامح چونکہ ایک بلند اخلاقی نصب العین کے ماتحت صادر ہوتا ہے اس لئے ابتدا ہی سے قابلِ عفو ہے گو اس سے منشا الٰہی کی مخالفت ہی کیوں نہ ہو۔

علاوہ ازیں آپؐ فطری عفو و کرم کی بنا پر، جو آپؐ کی طبیعت میں بدرجہ اتم موجود تھا، اور پیغمبرانہ الفت و محبت کی وجہ سے مجبور رکھے کہ ان کی معذرت قبول فرمائیں۔ باقی رہا "عفا اللہ عنک" کہنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں بدرجہ غایت تلطف و مہربانی کا اظہار کیا گیا ہے اور آپؐ کے نفسِ گرامی سے بوجھ دور کرنے کے لئے وارد ہوا ہے کیونکہ صاحب جلالت و مالک کبریائی اور ذی جبروت و ملکوت جبار و قہار سے خطاب با عتاب "لم اذنت" صادر ہوا تو ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مارے دہشت کے جاں بحق ہو جائیں اور خدا کو یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ آپؐ کو کوئی قلبی صدمہ پہنچے بلکہ اس معاملہ میں ایک اصلاحی پہلو اجاگر کرنا تھا۔ اسی لئے بکمال رحمت و شفقت سے "لم اذنت" سے قبل خوشخبری "عفا اللہ عنک" سے نوازا گیا۔ اس آیت میں یہی کچھ ہم نے بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔

اعتراض نمبر ۶ :

قرآنِ مقدس میں آیا ہے کہ :

"و وجدک ضالا فھدیٰ"

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو گمراہ پایا پس آپ کی رہنمائی کرتے ہوئے سیدھا راستہ دکھایا۔ اس آیت میں آپؐ کی طرف ضلالت کی نسبت کی گئی ہے جو عصمت کے منافی ہے۔ کلبی نے بھی اس جگہ ضلالت و کفر کے معنی کئے ہیں۔

الجواب :

معترض نے جو معنیٰ کیا ہے وہ درست نہیں۔ بلکہ اس کا معنیٰ یوں کیا جائے "اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو شریعت سے بیخبر پایا سو آپؐ کو شریعت کا راستہ بتلا دیا"۔

اس کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے اور بقاعدہ "القرآن یفسر بعضھا بعضا" یہی معنیٰ بہتر اور اولیٰ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ فرمانِ خداوندی ہے:

"کذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری" الآیۃ

اور "اسی طرح ہم نے آپؐ کی طرف اپنے "امر" کی روح کا القا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل نہ آپؐ قرآن سے واقف تھے اور نہ ایمان کی حقیقت سے۔ لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا کہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، اس کی صلاحیت و استعداد کے پیشِ نظر اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔"

جو معنیٰ ہم نے کیا ہے یعنی "علم شریعت سے ناواقفی" اس پر نقلی دلائل کے علاوہ عقلی دلائل و شواہد بہت ہیں مثلاً حضور علیہ السلام کی زندگی ہر ایک کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ کوئی آپؐ کا ایسا فعل یا قول ثابت نہیں ہو سکتا جس بنا پر آپؐ کی طرف ضلالت وکفر کی نسبت کی جائے۔ "فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ" ببانگ دہل اعلان کر رہا ہے کہ نبوت کے بعد کی زندگی تو کجا پہلی زندگی بھی ایک ایسا مثالی نمونہ ہے جس کے آثار و نشانات درخشاں ہیں۔ اگر کسی کو سکت ہے تو اس زندگی پر انگشت نمائی کر دکھائے۔ چنانچہ امام رازیؒ نے کوئی بیس وجوہ تاویل کا ذکر کیا ہے جن میں ایک وجہ جو پسندیدہ ہے وہ یہ ہے کہ ضلالت کے معنیٰ محبت والفت اور ذوق وشوق کے بھی آتے ہیں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت و وارفتگی پر ان کے پسرانِ عزیز نے کہا تھا کہ "انک لفی ضلالک القدیم" تو اس صورت میں معنیٰ یہ ہوں گے کہ ہم نے آپؐ کو بدرجہ غایت حق و صداقت کا عاشق و والا پایا۔ اور پھر اس محبت وشوق کی تسکین وتسلی یوں کی کہ آپؐ کو پورا نظامِ معرفت اور قانونِ حیات عطا فرمایا تو اس صورت میں بھی کوئی اشکال نہیں رہتا۔

اعتراض نمبر ۷:

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ازدواجی تعلقات کو بھی متعصب مستشرقین اور ان کے مقلد، تنگ نظر عیسائیوں نے اور ان کے ناہنجار حواری مردہ ضمیر آریہ وغیرہ نے ہدفِ تنقید بنایا ہے اور اعتراضات کا ایک خارزار پیدا کر کے وہ تمام گندہ مواد اپنی "مجمع افکار منشرہ" میں جمع کر ڈالا ہے جو اسلام کے اولین معاندین نے پیش کیا تھا۔ ان کے ترکش سے نکلا ہوا مسموم تیر ملاحظہ ہو، جگر وقلب پر پتھر کی بھاری بھرکم سِل رکھ کر سنیں:

"محمد (ص) کو کون سا نام دوں جس سے محمد (ص) کی زندگی کا فوٹو آنکھوں میں اتر آئے۔ پچاس سال کا تھا جب خدیجہ (رض) نے انتقال کیا۔ باسٹھ سال کا تھا مردہ ضمیر کے مالک ترسیٹھ سال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

از مؤلف) جب خود انتقال کیا۔ اس بارہ سال کے عرصہ میں دس عورتیں کیں یعنی سوا سال میں ایک، ان حالات میں اگر میں اپنے رنگیلے رسول کو بیویوں والا کہدوں تو کیا موزوں نہ ہوگا؟" (رنگیلا رسول ص ۴۸، ۴۹، ۵۱ بحوالہ مقدس رسول ص ۶)

الجواب:

معاندین معترضین اپنے دلوں کا غبار اور غم وغصہ کا اظہار صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ آپؐ نے آخری عمر میں متعدد نکاح کیوں کئے؟ صرف تعدد ازدواج ہی ان کے اندرون اور بیرون کو جلا کے جا رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپؐ نے متعدد نکاح کئے اور اسلام میں بھی تعدد ازدواج کو مباح قرار دیا گیا ہے لیکن اس میں کیا حکمت اور بھلائی تھی؟ اس سے ان کو رباطنوں کو کوئی تعلق نہیں ـــــــ اب ہم "تعدد ازدواج" کے عنوان سے اس کا آغاز کرتے ہیں جس میں کئی قسم کے مباحث آئیں گے اور یہ ثابت کیا جائیگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی بالکل "قانونِ فطرت" کے مطابق تھی۔

سب سے پہلے ان لغو اعتراضات کا مختصر تمہیدی جواب نعیم صدیقی کی زبانی سنئے:

پہلی بات تو یہ ذہن نشین کرنے کی ہے کہ انسانیت کا دورِ تاریخ جسے ہم حضورؐ کے زمانے تک پھیلا ہوا پاتے ہیں تکثیرِ نسل کا دور ہے۔ زمین کے قطعات جب ویران پڑے تھے، جہاں آبادی تھی، وہاں بھی چھدری تھی اور رزق کے ذرائع و وسائل کا میدان بھی کھلا پڑا تھا۔ بلکہ فطرتی طور پر نوعِ انسانی میں ازدیادِ نسل کا رجحان پورے زور سے کام کر رہا تھا۔ اس لئے اس دور کے کسی بھی تمدن کو لیں، اور کسی بھی مذہب کو دیکھیں، انسانی معاشروں میں تعدادِ ازدواج بہت بڑے بڑے پیمانوں پر پوری طرح مروج رہا ہے۔ خود شرائع الہیہ نے بھی اس کی اجازت دی اور بہت سے جلیل القدر انبیاء علیہ السلام جن میں خود انبیائے بنی اسرائیل نمایاں ہیں، کئی کئی نکاح کئے۔ اکا دکا انبیاءؑ نے ذاتی رجحان اور مخصوص حالات کی بنا پر گھربار کے بکھیڑوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنے آپ کو ہمہ تن دعوتِ حق کے کام میں بھی لگایا ہے مگر اکثر یت نے متاہل زندگی اختیار کی جیسا کہ قرآن خود شہادت دیتا ہے:

"ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية"

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تکثیرِ نسل اور تعداد ازدواج کے اسی دور کے آخر میں آتے ہیں اور آپؐ کے ذریعہ پہلی مرتبہ فرمانِ الٰہی سے تعدادِ ازدواج پر پابندی عائد ہوئی۔ حضورؐ نے جو بھی شادیاں کیں وہ اسی رخصت و اجازت سے کیں جو شریعتِ الہیہ میں چلی آرہی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری بات یہ سامنے رہے کہ حضور علیہ السلام کے اکثر و بیشتر نکاح جنسی داعیہ کے زیرِ اثر نہیں۔ بلکہ تحریک اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر عمل میں آئے۔ ان کی نوعیت سیاسی ہے۔ حضورؐ کا اپنا ارشاد محفوظ ہے:

"مالی فی النساء من حاجۃ" (دارمی روایت سہل بن سعد)

کہ میرے اندر عورتوں کے لئے کوئی طلب موجود نہیں ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں شادیاں حضورؐ نے دو ہی کی ہیں، ایک حضرت خدیجہؓ سے اور دوسری حضرت عائشہؓ سے۔ بقیہ نکاحوں کے لئے بعض اہم اجتماعی مصالح داعی ہوتے رہے اور ان مصالح کی خاطر آپؐ نے اپنی مصروف ترین زندگی اور انتہائی فقیرانہ معاشرت پر بھاری بوجھ لاد کر انسانیت کے لئے قربانی دی ہے۔

ذرا خیال کیجئے، ایک نوجوان جو ۲۵ برس تک ... مت تابی اور حیاداری کا نمونہ اس معاشرے میں پیش کرتا ہے جس میں شراب اور زنا کلچر ... سے قابلِ فخر پہلو ہوتے تھے۔ ۲۵ برس کو پہنچ کر بھی وہ لذت پسندی کا عام معیار چھوڑ کر ... نو عمر حسینہ کی بجائے ۴۰ سال کی ایک بیوہ کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ اس کے نصب العین بد ... ہی زیادہ ممد ہو سکتی ہے اور پھر ازدواجی لحاظ سے عمر کے بہترین ۲۵ برس اس ایک خاتون کے ساتھ گزار کر پچاس سال پورے کر لیتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں وہ گھٹیا باتیں سوچی جا سکتی ہیں جس کا چرچا معترضین نے کیا ہے؟

پھر ازدواج کی کثرت کا دور ۵۵ سے ۵۹ سال کا دور ہے۔ عرب جیسے گرم ملک کے لحاظ سے اس عمر میں جنسی رجحانات انحطاط کی طرف جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر خود ازواج کی عمروں کو دیکھیے تو دو کے علاوہ بقیہ کی عمریں بوقتِ نکاح ۲۰ سے سال سے اوپر تھیں اور پانچ کی عمریں تو ۳۶ تا ۵۰ برس تھیں۔ کیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے نوجوان اور حسین ترین عورتوں کی کمی تھی؟

پھر ایسا گھٹیا اعتراض اٹھانے والوں کو سوچنا چاہیئے تھا کہ وہ ہستی جس نے اپنے سر پر اتنے بڑے کام کا بوجھ اٹھایا تھا کہ نہ ان کو سکون بیسر تھا اور نہ رات کو آرام کا کوئی لمحہ اور وہ مجسمۂ عفت و حیا کہ جس نے انسانیت کو پردے کا عظیم بابرکت قانون عطا کیا (خود اس قانون پر یورپ کے لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں) اور آدم زاد کو قلب و نظر پر قابو رکھنا سکھایا اور وہ ہستی کہ جس کے اوقات کا زیادہ حصہ ریاست اور معاشرہ کے وسیع مسائل میں کھپ جاتا تھا اور جس کے نجی اوقات پیروں کو ورم کر دینے والے لمبے لمبے قیامِ صلوٰۃ میں صرف ہوتے تھے، آخر کیسے اس کے بارہ میں وہ فضول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باتیں سوچی جاسکتی ہیں؟

پھر لذت پسند شاہوں اور فاتحوں کی سی کوئی بات اس میں نہیں دکھائی دیتی۔ نہ وہ جابر و ظالم ہے نہ اسے شراب اور موسیقی اور فاخرہ لباسوں سے دلچسپی ہے بلکہ الٹا اس نے معاشرہ کو ان نفسانیت انگیز تفریحات سے پاک کیا۔ نہ اس نے ازواج کو دنیوی عیش و عشرت کے سامان فراہم کرکے دیئے اور نہ ریشم اور سونے سے ان کے بدنوں کو سجایا بلکہ اپنی درویشانہ زندگی کے رنگ میں ان کو بھی رنگ دیا پھر ان کی ایسی ناز برداری کبھی نہیں کی کہ ان کی خوشنودی تحریک کے مفاد پر مقدم ہو جائے یا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اصول بھی ترک کرنا پڑے بلکہ ایسے موقعوں پر ان کی سختی سے تادیب کی اور ایک موقع پر تو نان و نفقہ کا معیار بلند کرنے کے مطالبے پر ہی صاف صاف ان سے کہہ دیا کہ اس فقیری میں ساتھ دے سکو تو بہتر ورنہ میں رخصت کئے دیتا ہوں۔ کیا یہ سارے احوال مل جل کر ان لغو اعتراضات کا پوری طرح قلع قمع نہیں کر دیتے۔" (محسنِ انسانیت ص ۵۴۳)

یہ تو تمہیدی لحاظ سے کچھ بیان ہوا ہے اب مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم امرتسری کی زبانی اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو سنیں:

"نظامِ عالم میں دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف نظر کرنے سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ خالقِ کائنات نے ان سب چیزوں میں سے بعض کو مستعمل (کام میں لانے والی، برتنے والی) اور بعض کو مستعملہ یعنی قابلِ استعمال بنایا ہے۔ بے جان چیزوں میں سے مثلاً کپڑا برتن وغیرہ مستعملہ ہیں۔ جانداروں میں سے بھی سوائے انسان کے باقی تمام حیوانات انسان کیلئے مستعملہ ہیں۔ مثلاً گھوڑا، اونٹ، ہاتھی، گائے بیل، بھینس وغیرہ۔ اور انسان ان کا مستعمل (برتنے والا) ہے۔ اسی طرح انسان کی دونوں قسموں، (مرد و عورت) کو بھی دیکھیں کہ ان میں بھی یہ دستور جاری ہے یا یہ کہ دونوں مساوی ہیں؟ بعد غور اس نتیجہ پر پہنچنا کچھ مشکل نہیں کہ بیشک مرد مستعمل (برتنے والا) اور عورت مستعملہ (قابلِ استعمال) ہے۔ اس دعویٰ پر ہمارے پاس ہر طرح کے دلائل (فطری، عرفی، مذہبی) موجود ہیں۔

دلائل فطریہ:

۱۔ تزویج میں مرد مستعمل اور عورت مستعملہ ہے کیونکہ جب تک مرد جماع نہ کرنا چاہے، عورت اس سے جبراً نہیں کرا سکتی۔ اگر مرد چاہے تو جبراً کر سکتا ہے جس سے صاف ثابت ہے کہ مرد مستعمل اور عورت مستعملہ ہے۔

۲۔ آلۂ جماع و استعمال مرد کو عطا ہوا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۳۔ مرد و عورت کی ظاہری شکل اور ہیئت بھی اس نسبت کو بیان کرتی ہے۔ مرد کے چہرے پر عموماً وقتِ بلوغت بالوں کا نکلنا اور عورت کا منہ ہمیشہ کے لئے صاف رہنا جو اس کے مرغوب الطبع ہونے کا ایک قوی ذریعہ ہے، اس نسبت کی قوی دلیل ہے۔

۴۔ اولاد کے حق میں ماں کا مشقت اٹھانا۔ حالانکہ وہ نطفہ یقیناً مرد کا ہے، اس امر کو ثابت کرتا ہے کہ مرد مستعمل اور عورت مستعملہ ہے۔

۵۔ مرد کا عموماً تنومند اور طاقتور رہنا یہاں تک کہ تمام طاقت کے کاموں کا (مثل جنگ وغیرہ) سب کا متکفل ہونا اور عورت کا اس سے بالکل سبکدوش رہنا بھی اس امر کی دلیل یا تجربہ ہے کہ مرد مستعمل اور عورت مستعملہ ہے۔

<u>دلائل عرفی:</u>

۱۔ عموماً شادی کر کے خاوند کا عورت کو اپنے گھر میں لے جانا اور وقتِ نکاح اس کو کچھ دینا اور گھر میں لے جا کر اس پر مناسب حکومت کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ بنی آدم عورت کو مستعملہ جانتے ہیں۔

۲۔ عموماً بازاروں میں عورتوں کا زنا کیلئے مزین ہو کر بیٹھنا اور مردوں سے عوض لے کر ان سے زنا کرنا اور مردوں کا عوض دے کر ان سے بدفعلی کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ عورت بھی مثل دیگر اشیاء کے مستعملہ ہے (یہ ایک قبیح مگر مروج فعل ہے اور یہاں اس بات کو ذکر کرنے سے یہ مطلب نہیں کہ زنا یا ایسا استعمال جائز ہے بلکہ ہم نے اس کو دلائل فطری یا مذہبی میں بیان نہیں کیا۔ حقوق مانگنے والی خواتین کو ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اپنی آبرو بچانے کے لئے مرد کے اس ظلم کے خلاف حکومت سے بھرپور احتجاج کریں)

۳۔ عموماً ہر قوم کا عورتوں کو زیب و زینت سے مزین رکھنا اور زینت کو معیوب نہ سمجھنا بلکہ عورتوں کا بھی طبعی طور پر اس طرف مائل رہنا اس امر کا ثبوت ہے کہ کل قومیں عورت کو مستعملہ جانتی ہیں۔

۴۔ عورت کا حمل کی وجہ سے تکلیف اٹھا کر بھی، ہر مذہب میں، بچہ کا باپ کی نسل سے ہونا بھی اس امر کا قرینہ بلکہ دلیل ہے کہ عورت مستعملہ ہے (یہ دلیل اور دلائل فطریہ کی چوتھی دلیل آپس میں متغائر ہیں کیونکہ اس میں عورت کے حمل کا لحاظ ہے اور اس میں بچہ کی نسبت باپ کی طرف ہونے کا ذکر ہے۔

(ہمیں افسوس ہے کہ تنگیٔ صفحات کی بنا پر یہ بحث مکمل نہیں ہو سکی، باقی آئندہ ان شاء اللہ۔ ادارہ)

© rasailojaraid.com